International refereed journal for Urdu
ISSN: 2348-3687, Vol. 3, Issue: 10th
Available on: www.urdulinks.com/urj

Topic: Bano Qudsia…. By Dr. Ghulam Shabbir Rana, Pakistan

بانو قدسیہ :کس سمت لے گئیں مجھے اس دِل کی دھڑکنیں

ڈاکٹر غلام شبیررانا

پاکستان میں اردو ادب میں تانیثیت کی چاندنی ماند پڑ گئی اور اردو ادب کا ہنستا بولتا چمن جان لیوا سکوت اور مہیب سناٹوں کی زد میں آ گیا۔اردو فکشن کی وہ شمع فروزاں ہمیشہ کے لیے گُل ہو گئی جو سفاک ظلمتوں میں حوصلے اور اُمید کی تابانی کی نقیب تھی۔زندگی بھر سماج اور معاشرے میں رو نما ہونے والی کہانیاں زیبِ قرطاس کرنے والی ابد آشنا اسلوب کی حامل ادیبہ بانو قدسیہ کی زندگی کی کہانی اپنے اختتام کو پہنچ گئی۔ وہ جری ادیبہ جس نے زندگی بھر عورت کے عزم وہمت کی داستان رقم کی پیمانۂ عمر بھر کر راہِ رفتگاں کی جانب سدھار گئی۔ اپنے لافانی اسلوب کے اعتبار سے بانو قدسیہ جتنی بڑی ادیبہ تھی، شخصیت اور وقار کے لحاظ سے اتنی ہی عظیم خاتون بھی تھیں ۔وہ خاتون جس نے سات عشروں کے دوران انسانیت کے وقار اور سر بلندی کو اپنا نصب العین بنا کر پرورش لوح و قلم کو اپنا شعار بنایا ہماری بزمِ وفا سے اُٹھ کر راہِ فنا پر چل پڑیں۔دنیا بھر کی خواتین کے مسائل پر کھل کر لکھنے والی حریتِ فکر کی اس مجاہدہ نے جو طرزِ فغاں اپنائی وہ آنے والی نسلوں کے لیے کئی صدیوں تکمشعلِ راہ ثابت ہو گی۔اجل کے بے رحم ہاتھوں سے جدید اُردو فکشن میں تانیثیتی ادب کے ہمالہ کی ایک سر بہ فلک چوٹی زمیں بوس ہو گئی ۔وطن ،اہلِ وطن اورپُوری انسانیت کے دِل کی راحت اور سکون کی تمنا کرنے والی ادیبہ حرکتِ قلب بند ہوجانے کے باعث دائمی مفارقت دے گئی۔اٹھائیس نومبر 1928 کو فیروز پور (بھارت) کے ایک عیسائی گھرانے سے علم وادب کی روشنی کے فقید المثال سفر کا آغاز کرنے والی یہ راسخ العقیدہ مسلمان اور عظیم محب وطن پاکستانی ادیبہ چار فروری 2016 کی شام لاہور میں پیمانۂ عمر بھر کر آفاق کی منزل سے راہِ فنا کی جانب سدھار گئیں ۔حریتِ ضمیر سے جینے کی روش اپنانے والی اس فرض شناس، باوقار اور باضمیر ادیبہ نے اپنی تخلیقی کامرانیوں سے جریدۂ عالم پر اپنا دوام ثبت کر دیا۔ تقدیر اور وقت کا اس سے بڑا سانحہ کیا ہوگا کہ علم وادب کی کہکشاں سے وہ آفتاب و ماہتاب اور نیر تاباں مسلسل غروب ہو کر عدم کی وادیوں میں اوجھل ہوتے چلے جارہے ہیں جن کے دبنگ لہجے سے مہیب سناٹے ختم ہوئے ،جن کی ضیا پاشیوں سے سفاک ظلمتیں کافور ہوئیں اور ہر طرف علم و ادب کا اُجالا پھیلا۔یہ ایک لرزہ خیز اور اعصاب شکن المیہ ہے کہ کافی عرصے سے افقِ ادب پر کوئی نیا ستارۂ سحر طلوع ہو کر ٹمٹماتا دکھائی نہیں دیتا۔بانو قدسیہ نے اُردو ادب میں اخلاقیات،تانیثیت ،روحانیات اور اقدارِ عالیہ کو مقاصد کی رفعت کے اعتبار سے ہم دوشِ ثریا کر دیا۔ قحط الرجال کے موجودہ دور میں ایسی نابغۂ روزگار ادیبہ کے اُٹھ جانے کی خبر سن کر ہر شخص کا دِل بیٹھ گیا اور ادبی دنیا سے وابستہ ہر شخص کا دِل سوگوار اور آنکھ اشک بار دکھائی دینے لگی۔ماڈل ٹاؤن لاہور کی داستان سرائے کے مکین حسنِ اخلاق ،انسانیت کے وقار اور سر بلندی، مشرقی تہذیب و تمدن ،اخلاق واخلاص اور روحانیت کی وہ داستان جسے وہ زندگی بھر سناتے رہے اب اپنے اختتام کو پہنچ گئی ہے۔اب داستان سرائے کے اداس بام ، کُھلے در اور پریشاں کھڑکیاں اپنے ان مکینوں کی صورت کو ترس جائیں گی۔ بانو قدسیہ کی تخلیقی تحریروں میں نسائی جذبات اورزندگی کی درخشاں اقدار و روایات کو تصوف سے ہم آہنگ کرنے کی جو سعی موجود ہے وہ اسلوب کی ندرت اور انفرادیت کے اعتبار سے اپنی مثال آپ ہے۔ یہاں یہ امر قابل توجہ ہے کہ بانو قدسیہ نے تانیثیت کو مردوں سے تصادم کی راہ پر گامزن ہونے سے روکا اور مردو اور خواتین کو باہمی احترام اور مساوی بنیادوں پر مصروف عمل رہنے کی راہ دکھائی۔

بانو قدسیہ کا تعلق ایک ممتاز علمی وادبی خاندان سے تھا جس نے تحریک پاکستان میں بھر پور حصہ لیا۔ان کے والد بدر الزماں نے زرعی سائنس میں گریجویشن کی اور پبلک سیکٹر کے ایک بڑے زرعی فارم کے مہتمم کی حیثیت سے خدمات انجام دیتے رہے۔ جب بانو قدسیہ ساڑھے تین برس کی تھیں توان کے والد عالم شباب میں اکتیس سال کی عمر میں وفات پا گئے ۔ تقدیر کی تو پہچان ہی یہی ہے کہ وہ ہر لمحہ ہر گام انسانی تدبیر کی دھجیاں اڑا دیتی ہے۔ بانو قدسیہ کی والدہ ذاکرہ بیگم نے ستائیس سال کی عمر میں بیوگی کی چادر اوڑھ لی اور مشیتِ ایزدی کے سامنے سر تسلیم خم کر دیا۔ اس خاتون نے تقدیر کے ستم سہہ کر صبر و تحمل سے اپنے دو کم سِن بچوں کی پرورش پر اپنی توجہ مرکوز کر دی۔ان کی دلی خواہش تھی کہ اپنے ننھے بچوں کو آلامِ روزگار کی تمازت سے محفوظ رکھیں تاکہ یہ گُلِ نو شگفتہ گلشنِ ہستی کو اپنی عنبر فشانی سے معطر کر دیں ۔ایک صابر و شاکر ماں کی حیثیت سے ذاکرہ بیگم نے اپنے بیٹے پرویز اور بیٹی بانو قدسیہ سے اپنا مستقبل اور بقیہ زندگی

وابستہ کر دی اور اپنے ارمانوں کو اپنے دِل میں ہمیشہ کے لیے سموئے صبر واستقامت کی تصویر بن گئیں۔ اپنے ملبوسِ حیات سے ایک بڑا ٹکڑا قطع کر کے اپنے جگر گوشوں کے چاک دامن کو رفو کرنے کا نام ہی مامتا ہے۔ ہر ماں اپنی اولاد کو یہ عطیہ دے کر اس ایثار کو فراموش کر دیتی ہے تا کہ صبح تمنا کی منتظر کم سِن اولاد کی زندگی کی دُھندلی صبح کو درخشاں کیا جاسکے۔ ذاکرہ بیگم نے اپنے یتیم، ہونہار اور کم سِن بچوں کی تعلیم وتربیت میں گہری دلچسپی لی اور انھیں ذرے سے آفتاب بننے کے مواقع فراہم کیے۔ بغض وعناد، وہم وگماں، محرومی اور مایوسی کی حرم سرا میں زندگی جیسی متاعِ بے بہا کو ٹھہرانا گھر پھونک کر تماشا دیکھنے جیسی مہلک غلطی ہے۔ ذاکرہ بیگم نے شکستگی اور کرختگی کی لرزہ خیز اور اعصاب شکن یادوں سے گلوخلاصی حاصل کر کے اپنی اولاد سے بے لوث محبت کو زادِ راہ بنایا اور اپنے بچوں کو اپنے پاؤں پر کھڑا ہونے کے قابل بنانے میں کامیاب ہو گئی۔ بانو قدسیہ کے بھائی پرویز نے فنِ مصوری میں نام پیدا کیا جس کا چند برس قبل انتقال ہو گیا تھا۔

بانو قدسیہ نے ابتدائی تعلیم دھرم شالہ سکول فیروز پور (بھارت) سے حاصل کی۔

بانو قدسیہ نے کم عمری ہی میں اپنی تخلیقی صلاحیتوں کا لوہا منوایا۔ جب وہ پانچویں جماعت میں زیر تعلیم تھیں، اس وقت سے ان کی کہانیاں بہت مقبول ہو گئی تھیں۔ قیام پاکستان کے بعد بانو قدسیہ کے خاندان نے ارضِ پاکستان منتقل ہونے کا فیصلہ کیا اور لاہور میں قیام کیا۔ بانو قدسیہ نے اسلامیہ کالج، لاہور سے انٹرمیڈیٹ کیا اور سال 1949 میں کینیرڈ کالج لاہور سے بی۔اے کیا۔ تخلیقِ ادب سے انھیں گہری دلچسپی تھی، بانو قدسیہ کا پہلا افسانہ " واماندگیٔ شوق" زمانہ طالب علمی ہی میں سال 1950 میں لاہور سے شائع ہونے والے ممتاز ادبی مجلّہ "ادبِ لطیف" میں شائع ہوا۔ سال 1951 میں بانو قدسیہ نے گورنمنٹ کالج، لاہور میں ایم۔اے اردو میں داخلہ لیا اور یہیں سے ایم۔اے اردو کیا۔ ممتاز ادیب اشفاق احمد اسی ادارے میں ان کے ہم جماعت تھے۔ سال 1956 میں بانو قدسیہ نے اشفاق احمد سے شادی کر لی اور اسلام قبول کر لیا۔ اُردو زبان وادب کی ترویج واشاعت میں گہری دلچسپی لینے والے اس نو بیاہتا جوڑے نے گیسوئے اُردو کے نکھارنے میں کوئی کسر اُٹھا نہ رکھی۔ نمود ونمائش اور شہرت و ناموری کی تمنا سے بے نیاز رہتے ہوئے اس باصلاحیت ادبی جوڑے نے سدا عجز وانکسار کو زادِ راہ بنایا۔ دونوں کی سوچ یکساں تھی اور زندگی کا لائحۂ عمل بھی ایک جیسا تھا۔ اس کی ایک مثال یہ ہے کہ اشفاق احمد نے اپنے نام کے ساتھ "خان" لکھنا ترک کر دیا جب کہ بانو قدسیہ نے ذات پات کے منفی تصور سے نجات حاصل کر لی اور اپنے نام کے ساتھ چٹھہ لکھنا چھوڑ دیا۔ ان دردآشنا ادیبوں نے دُکھی انسانیت کی خدمت کے سلسلے میں سدا روح بلالیؓ کو حرزِ جاں بنایا۔ اس کے صلے میں قدرت کاملہ کی طرف سے انھیں جو قبول عام کی سند ملی اس کے وسیلے سے انھوں نے اقلیمِ ادب میں اپنے عقیدت مندوں، مداحوں اور علمی و ادبی دنیا سے وابستہ افراد کے دلوں پر شانِ سکندری کے ساتھ راج کیا۔ احباب کے ساتھ ان کے پُر خلوص، بے لوث، مثبت اور تعمیری سلوک کا ایک عالم معترف تھا جس کے جواب میں انھیں بھی اسی نوعیت کے سلوک کا مستحق سمجھا جاتا تھا۔ شادی کے بعد دونوں نے مِل کر ادبی مجلّہ " داستان گو" کی اشاعت کا آغاز کیا جو چار سال تک باقاعدگی سے شائع ہوتا رہا مگر بعض ناگزیر مسائل کے باعث کچھ عرصہ بعد یہ مجلّہ اپنی اشاعت کا سلسلہ جاری نہ رکھ سکا۔ اشفاق احمد کے ساتھ کامیاب شادی کے ساتھ ہی بانو قدسیہ کی خوابیدہ ادبی صلاحیتوں کو صیقل کرنے اور ان کی تخلیقی فعالیتوں کو صحیح سمت عطا کر کے ان کی عظیم شخصیت کی تکمیل میں مدد ملی علم وادب کی دنیا کا یہ مثالی جوڑا ساٹھ سال تک پرورشِ لوح وقلم میں مصروف رہا اور پُوری دنیا میں جدت فکر کی آئینہ دار اپنی فقید المثال تخلیقی کامرانیوں کی دھاک بٹھا دی۔ ایسا محسوس ہوتا تھا کہ دونوں جنم جنم کے ساتھی ہیں اور دونوں ایک دوسرے کے لیے لازم وملزوم ہیں۔ بانو قدسیہ کے تین بیٹے ہیں جو مختلف شعبوں سے وابستہ ہیں اور ملک وقوم کی خدمت میں مصروف ہیں۔ بانو قدسیہ کی علمی، ادبی، قومی اور ملی خدمات کا دنیا بھر میں اعتراف کیا گیا۔ دنیا بھر کے ادیب ان کے معتقد تھے اور انھیں "بانو آپا" کہہ کر مخاطب کرتے تھے۔ بانو قدسیہ نے عملی زندگی کے ہر شعبہ میں اپنی خداداد صلاحیتوں، تخلیقی کامرانیوں اور ہر مرحلۂ زیست پر اپنی عظمت کے انمٹ نقوش ثبت کیے۔ وہ ایسی ہفت اختر شخصیت کی مالک نابغۂ روزگار ادیبہ تھیں جس کے متعدد رنگ تھے جن میں سعادت مند بیٹی، ہونہار طالبہ، ابد آشنا اسلوب کی حامل فقید المثال ادیبہ، فرماں بردار اہلیہ، اپنی اولاد کی مونس وغم خوار والدہ، سادہ اور باوقار زندگی بسر کرنے والی عورت، انسانیت کے وقار اور سربلندی کے لیے سرگرم عمل رہنے والی حریت فکر وعمل کی مجاہدہ، جبر کا ہر انداز مسترد کر کے حق گوئی وبے باکی کو شعار بنانے والی سماجی کارکن، وطن اور اہلِ وطن سے والہانہ محبت اور قلبی وابستگی رکھنے والی مصلح کا آہنگ دیکھ کر قاری حیرت زدہ رہ جاتا ہے کہ ہمارے خاکستر میں کیسی چنگاری موجود تھی۔

زمانہ طالب علمی ہی سے اپنے من میں ڈوب کر سراغِ زندگی پانے، ایک شانِ استغنا کے ساتھ داستان سرائے میں انجمن خیال آراستہ کرنے کی دُھن میں پرورش لوح وقلم کو اپنا نصب العین بنانے والی اس ادیبہ کی آواز لمحات نہیں بل کہ آنے والی صدیاں بھی سنتی رہیں گی اور ہر دور کی داستاں میں اس ادیبہ کا نام دہرایا جاتا رہے گا۔ بانو قدسیہ نے اپنے عہد کے جن ممتاز ادیبوں سے مِل کر تخلیقِ ادب کی شمع فروزاں رکھی ان میں اشفاق احمد، قدرت اللہ شہاب اور ممتاز مفتی کا نام کسی تعارف کا محتاج نہیں۔ بانو قدسیہ کی الم ناک وفات سے اردو فکشن کا وہ عہدِ زریں اپنے اختتام کو پہنچا جس کی تابانیاں اشفاق احمد، انتظار حسین، عبداللہ حسین اور قرۃ العین حیدر کی مرہونِ منت تھیں۔ یہ وہ زیرک، فعال اور مستعد تخلیق کار تھے جو محشر عمل تھے جنھوں نے مسلسل دو نسلوں تک نئی نسل کی کشتِ جاں کو اپنی فکر پرور اور بصیرت افروز تخلیقات سے سیراب کیا۔ تخلیقِ ادب میں اخلاقیات اور روحانیات کو زادِ راہ بنانے والی اس نابغۂ روزگار ادیبہ کی تحریروں میں جو بے مثال گہرائی اور گیرائی موجود تھی وہ ان کے منفرد اسلوب کا منھ بولتا ثبوت ہے۔ بانو قدسیہ نے سلطانیٔ جمہور کو ہمیشہ قدر کی نگاہ سے دیکھا اور قدرت اللہ

شہاب کی حق گوئی اور بے باکی کو ہمیشہ لائق تحسین سمجھا۔ بانو قدسیہ نے مظلوم اور دُکھی خواتین سے جو عہد وفا استوار کیا اسے علاج گردش لیل و نہار قرار دیتے ہوئے زندگی بھر اس پر عمل کیا۔ معاشرے کی پس ماندہ اور الم نصیب خواتین کی ڈھارس بندھاتے ہوئے ،ان کی مونس و غم خوار بن کر انھیں دلاسا دیتے ہوئے اور انھیں جہد و عمل پر مائل کر کے بانو قدسیہ نے خواتین کو اذیتوں اور عقوبتوں سے دوچار کرنے والے فراعنہ کی سادیت پسندی اور رعونت کے خمار اور مکر کا پردہ فاش کیا اور قہر و انتقام اور غیظ و غضب کے ان خود ساختہ دیوتاؤں کے مجسموں کو پاش پاش کر دیا۔ بانو قدسیہ کو تصوف سے گہری دلچسپی تھی۔ان کا خیال تھا کہ ممتاز ادیب قدرت اللہ شہاب زندگی بھر یمن سے تعلق رکھنے والے حضرت اویس قرنیؓ کا عقیدت مند رہا اور وہ اویسی سلسلہ کا ایسا صوفی تھا جسے خالقِ کائنات نے مستقبل کی پیش بینی کی صلاحیت سے متمتع کیا تھا۔ اویسی تصوف کے مطابق کسی عقیدت مند کا اپنے روحانی پیشوا کے ساتھ بالمشافہ ربط ضروری نہیں ۔اس مقصد کے لیے قلب اور روح کی وجدانی کیفیات ہی دلوں کو مرکز مہر و وفا کرنے اور ایام کا راکب بننے کی معجز نما صلاحیت سے متمتع ہونے کے لیے کافی ہیں ۔قدرت اللہ شہاب کے انتقال کے بعد زندۂ جاوید اسلوب کے حامل اس لافانی ادیب کی آخری آرام گاہ پر سالانہ عرس کی تقریبات کے انعقاد میں اشفاق احمد اور بانو قدسیہ نے گہری دلچسپی لی۔ذوق سلیم سے متمتع اردو ادب کے قارئین بانو قدسیہ کو اردو نثر کی ملکۂ عالیہ قرار دیتے تھے۔ بلاشبہ مسلسل سات عشروں تک اقلیم ادب میں اسی ملکہ کے نام کا سکہ چلتا رہا ۔ بانو قدسیہ نے ”آدھی بات“ جیسا موثر، مقصدیت ، اور اصلاح و افادیت اور سے لبریز ڈرامہ لکھا جسے کلاسیک کا درجہ حاصل ہے۔ بانو قدسیہ کے یادگار ڈراموں میں تماثیل ،حوا کے نام، سہارے اور خلیج شامل ہیں ۔اردو اور پنجابی زبان پر انھیں جو خلاقانہ دسترس حاصل تھی وہ ان کی تحریروں سے نمایاں ہے۔ان کے شوہر اشفاق احمد نے جب فلم ”دھوپ سائے“ بنائی تو اس فلم کی کہانی بانو قدسیہ نے لکھی۔

بانو قدسیہ کی پہلی ڈرامہ سیریل ”سدھراں“ تھی جسے بے حد پسند کیا گیا۔ بانو قدسیہ نے اپنی وقیع تصانیف سے اُردو ادب کی ثروت میں اضافہ کیا۔ان کا معرکہ آرا ناول راجہ گدھ سال 1981 میں شائع ہوا جس کی اشاعت کے ساتھ ہی وہ شہرت اور مقبولیت کی بلندیوں پر جا پہنچیں ۔ اس مقبول ناول کی دنیا بھر میں زبردست پزیرائی ہوئی۔ اس ناول کا شمار دنیا کی اہم ترین تصانیف میں ہوتا ہے جس کا کئی زبانوں میں ترجمہ ہوا۔ اردو میں اب تک اس ناول کے تیس ایڈیشن شائع ہو چکے ہیں ۔ جہاں تک قارئین کی پزیرائی کا تعلق ہے اردو ادب میں رحیم گُل کے ناول ”جنت کی تلاش“ کے علاوہ کوئی ناول اس کی گرد کو بھی نہیں پہنچتا۔ اس ناول میں مصنفہ نے حرام اور حلال کے مابین پائی جانے والی حدِ فاصل کو تصوف، روحانیات اور اخلاقیات کے تناظر میں دیکھنے کی سعی کی ہے۔ صدیوں سے ہمارے معاشرے میں چغد، شپر، بجو اور کرگس کو نحوست اور نجاست کی علامت سمجھا جاتا ہے۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ پس ماندہ ممالک کے مفلوک الحال باشندے ہجومِ کرگساں میں گِھر گئے ہیں۔اس ناول میں گدھ ایک علامت ہے جسے ایک نفسیاتی کُل کے روپ میں پیش کیا گیا ہے ۔ گدھ کا علامتی اور استعاراتی حوالہ دے کر قاری کے لاشعور میں استحصالی معاشرے کے فسطائی جبر کے بارے میں پائے جانے والے کرب کو متشکل کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ کرگس کے جہاں میں عفونت، ذلت، تخریب، نحوست ، نجاست ، بے برکتی ، بے توفیقی اور حرام خوری عام ہوتی ہے ۔ گدھ کی پہچان ہی یہ ہے کہ منحوس طائر حرام جانوروں کے گلے سڑے اور عفونت زدہ مردہ ڈھانچے نوچنے اور کھدیڑنے میں لذت محسوس کرتا ہے۔ ہمارا روزمرہ کا مشاہدہ ہے کہ سیکڑوں گدھ غول در غول کُوڑے کے ہر اس غلیظ ڈھیر پر پہنچتے ہیں جہاں سے عفونت و سڑاند اور نجاست و کثافت کے بھبوکے اُٹھ رہے ہوتے ہیں۔ گدھ کی سادیت پسندی اور لذت ایذا کی درندگی سے کون واقف نہیں ۔ بانو قدسیہ نے اس معرکہ آرا ناول میں آسودگی ، راحت اور شادمانی کی تمنا کے روحانی اور اخلاقی پہلوؤں کی جانب توجہ مرکوز کرنے پر مائل کیا ہے۔ جب بھی کسی معاشرے میں جلبِ زر، حصولِ منفعت ، مفاد پرستی، اقربا پروری، مفت خوری، ضمیر فروشی ، بے غیرتی ، بے ضمیری اور حرام خوری کا عفریت ہر سُو منڈلانے لگے تو یہ سمجھ لینا چاہیے کہ معاشرہ جان لیوا بے حسی کی لپیٹ میں آ گیا ہے۔ وقت کے اس سانحہ کے نتیجے میں ایسے بد قسمت معاشرے میں جاہل کو اس کی جہالت کا انعام دیا جاتا ہے اور چرخ نیلی فام سے بھی پرے پرواز کرنے والے عقابوں کے نشیمن میں کرگس، زاغ و زغن اور بُوم و شپر گھس جاتے ہیں۔ سب سے بڑھ کر المیہ یہ ہوتا ہے کہ ظالم و سفاک ، موذی و مکار استحصالی عناصر زندگی کی اقدار عالیہ، درخشاں روایات اور مسلمہ اخلاقی معائر کو معاشرے سے بارہ پتھر کرنے کی کوشش کرتے ہیں ۔ یہ امر کسی بھی معاشرے کے استحکام اور قوم کی بقا کے لیے خطرے کی گھنٹی اور بہت بُرا شگون سمجھا جاتا ہے ۔اس کے نتیجے میں افراد جس ذہنی، قلبی، جسمانی اور روحانی اذیت سے دوچار ہوتے ہیں ،اس کا تریاق عنقا ہے۔ جبر اور انصاف کشی کے مذموم ہتھکنڈے ایسے بد قسمت معاشرے میں اخلاقیات کو ابتذال اور انحطاط کے اعتبار سے تحت الثریٰ میں پہنچا دیتے ہیں۔ ایسی اقوام کی تاریخ ہی نہیں ان کا جغرافیہ بھی مکمل طور پر بدل جاتا ہے۔ سیلِ زماں کے تھپیڑے ہجومِ کرگساں کو نیست و نابود کر کے ان کی سب بد اعمالیوں کو بہا لے جاتے ہیں اور یہ سب گدھ عبرت کی مثال بن جاتے ہیں ۔ درِ کسریٰ کے کھنڈرات پر منڈلانے والے کرگس نوشتۂ دیوار پر نظر رکھیں تو انھیں سب حقائق معلوم ہو جائیں گے۔

بانو قدسیہ کے شہرۂ آفاق ناول راجا گدھ کے بارے میں ڈاکٹر نثار احمد قریشی کہا کرتے تھے کہ اس زندۂ جاوید تخلیق کے موضوعات کو نوائے سروش سے تعبیر کیا جا سکتا ہے۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ اس ناول کے تمام موضوعات کی تخلیق کے پس پردہ کسی مافوق الفطرت قوت کی معجز نما تحریک ہے جس نے ہر سطر کو زرنگار اور ہر کردار کو لا زوال اور یادگار بنا دیا ہے۔ ممتاز ادیب غلام علی خان چین کو اشفاق احمد اور بانو قدسیہ کا اسلوب بہت پسند تھا۔ ان کا خیال تھا کہ تخلیقی قوت اور ادبی فعالیت کے اعتبار سے بانو قدسیہ کا مقام اشفاق احمد سے اس لیے بلند ہے کہ منفرد اسلوب کی حامل اس باکمال ادیبہ

نے اشفاق احمد جیسے نخلِ تناور کے سائے میں رہتے ہوئے بھی اپنے عظیم الشان تخلیقی وجود کا اثبات کیا ہے۔ عالمی ادب کے نباض امیر اختر بھٹی کی رائے تھی کہ بانو قدسیہ کی تخلیقات اور ان کے پس پردہ کارفرما لاشعوری محرکات کا تجزیاتی مطالعہ کرنے سے یہ حقیقت روزِ روشن کی طرح واضح ہو جاتی ہے کہ بانو قدسیہ کے فکر و خیال کی وادی میں گونجنے والے سب مضامین کے سوتے وجدان اور غیب سے پُھوٹتے ہیں۔ بادی النظر میں یہ حقیقت واضح ہے کہ راجا گدھ میں حلال اور حرام کے بارے جن اسلامی معائر کو پیشِ نظر رکھا گیا ہے وہ سب کشف و کرامات اور الہام کی عطا ہیں۔

ان کی مقبول تصانیف میں آتش زیرِ پا، آدھی بات، آسے پاسے، امر بیل، ایک دن، بازگشت، پُروا، پھر اچانک یوں ہوا، پیا کا نام دیا، تماثیل، توبہ شکن، توجہ کی طالب، چہار چمن، چھوٹا شہر بڑے لوگ، حاصل گھاٹ، حوا کے نام، دست بستہ، دوسرا دروازہ، دوسرا قدم، راجہ گدھ، راہِ رواں، سامانِ وجود، سدھراں، سورج مکھی، شہرِ بے مثال، شہرِ لازوال۔ آباد ویرانے، فٹ پاتھ کی گھاس، کچھ اور نہیں، لگن اپنی اپنی، مردِ ابریشم، موم کی گلیاں، ناقابلِ ذکر اور ہجرتوں کے درمیان شامل ہیں۔ بانو قدسیہ کو اس بات کا قلق تھا کہ تیسری دنیا کے اقتصادی لحاظ سے پس ماندہ ممالک میں مفلوک الحال خواتین کی بے سمتی، بے چہرگی اور عدم شناخت کا مسئلہ روز بہ روز گمبھیر ہوتا چلا جا رہا ہے۔ آج بھی ان پس ماندہ ممالک میں معاشرتی زندگی پتھر کے زمانے کی یاد دلاتی ہے۔ ان ممالک کی غریب اور سادہ لوح خواتین اگر کبھی خوابِ غفلت سے بیدار ہونے کی کوشش کرتی ہیں تو وہاں کے خود غرض اور ہوس پرست مرد اپنی خواتین کو بن مانگے کی نمود و نمائش، زیب و زینت، تزئین و آرائش اور راحت و آسائش کے سبز باغ دکھا کر مدہوش کر دیتے ہیں۔ پس نو آبادیاتی دور میں ان ممالک میں جب صنعتی ترقی کا آغاز ہوا تو فکر و نظر کی کایا پلٹ گئی۔ یہ حالات کی ستم ظریفی نہیں تو اور کیا ہے کہ کھیتوں، کھلیانوں اور گھروں کے آنگن میں خون پسینہ ایک کرنے والی خواتین کو تن آسانی اور عیش کوشی کا رسیا بنا دیا گیا۔ سب سے بڑھ کر المیہ یہ ہوا کہ دیہی خواتین بھی خانہ داری کے کاموں، محنت اور جفاکشی کے بجائے سایوں اور سرابوں کے تعاقب میں الجھ کر رہ گئیں۔ بڑے شہروں اور قصبات میں ہوس پرست مردوں کی خود غرضی نے عجب گُل کھلایا۔ ساری دنیا بدل گئی، وقت بدل گیا اور دنیا کا نقشہ بھی تبدیل ہو گیا مگر خواتین کے حالات جوں کے توں رہے۔ تاریخ کے ہر دور کی طرح اس بار بھی خواتین اپنی سادگی کے باعث مات کھا گئیں۔ نئے دور میں مردوں نے خواتین کو گھر کی چار دیواری سے باہر نکل کر حصولِ روزگار کے لیے میدان میں اترنے کی راہ دکھائی اور کنبے کی کفالت کی ذمہ داری خواتین کے سپرد کر کے خود بے خودی اور دل لگی کی تمنا میں خیالوں کی دنیا میں کھو گئے۔ معاشرتی زندگی میں خاوند اور بیوی کا آپس کا زندگی بھر کا بندھن ایسا روپ دھار گیا جس کے نتیجے میں چراغِ خانہ اور وفا شعار ماں تا کو خاندان کی کفالت کرنے والی شمعِ محفل میں بدل دیا گیا۔ بانو قدسیہ کا خیال تھا کہ گھروں میں مقیم قناعت پسند خواتین نے جس بے لوث محبت، ایثار، سادگی، دردمندی، عجز و انکسار، خلوص، انسانی ہمدردی، وقار اور خودداری کے ساتھ رنگ، خوشبو اور حسن و خوبی کے تمام استعارے نکھارے ہیں وہ ان کے کردار کی عظمت کی دلیل ہے۔ گھروں کی صابر و شاکر خواتین نے اپنی زندگی کو سنوارنے اور سکون کو یقینی بنانے کے لیے معافی مانگ لینے اور معافی دے دینے کا جو روّیہ اپنا یا ہے وہ ان کی وسعتِ نظر اور عالی ظرفی کا مظہر سمجھا جاتا ہے۔ انھوں نے زندگی بھر اختلاف سے دامن بچا کر اتفاق سے رہنے کی تلقین کی۔ بانو قدسیہ نے جدید دور کی زندگی کے نشیب و فراز کی جس صراحت کے ساتھ لفظی مرقع نگاری کی ہے وہ ان کی حق گوئی اور بے باکی کی عمدہ مثال ہے۔ قحط الرجال کے موجودہ دور میں ہوس نے نوعِ انساں کو انتشار کی بھینٹ چڑھا دیا ہے۔ بانو قدسیہ کو اس بات کا رنج تھا کہ مادی دور کی لعنتوں نے عدم برداشت، ہوس اور خود غرضی کو ہوا دی ہے۔ ان کی دلی تمنا تھی کہ تعلیم یافتہ خواتین کو نمود و نمائش اور فیشن کی بھیڑ چال سے بچنا چاہیے۔ بانو قدسیہ کی تحریروں میں پائی جانے والی روحانیت، پر خلوص جذبات کی تمازت، عزم و ہمت، ولولہ اور جوش قاری کو جہانِ تازہ میں پہنچا دیتا ہے۔ وہ یہ چاہتی تھیں کہ خواتین کو اپنے دل میں توقعات اور ارمان کم سے کم رکھنے چاہئیں تا کہ اگر یہ توقعات اور ارمان پورے نہ ہوں تو کسی غیر معمولی سانحہ کا اندیشہ نہ رہے۔ جب توقع اُٹھ جاتی ہے تو حکایتوں اور شکایتوں کے سب سلسلے دم توڑ دیتے ہیں۔ اس موضوع پر بانو قدسیہ نے لکھا ہے:

> ”اِن توقعات کا کچھ پتا نہیں چلتا، کس وقت، کیسے یہ دِل میں پروان چڑھتی ہیں، بالکل ٹھہرے ہوئے پانیوں پر جیسے کائی آہستہ آہستہ نامعلوم طریقے سے چڑھ جاتی ہے۔ تمھارے دِل کا شفاف پانی بھی کسی توقع کی وجہ سے متعفن ہو گیا ہے۔“ (فٹ پاتھ کی گھاس۔ صفحہ 61)

خزاں کے سیکڑوں مناظر میں بھی طلوعِ صبحِ بہاراں کی آس بندھانے والی اس یگانۂ روزگار ادیبہ کی تخلیقی تحریروں نے تصوف اور روحانیت کے امتزاج سے وہ سماں باندھا کہ پتھروں سے بھی اپنی تاثیر کا لوہا منوا لیا۔ معاشرتی زندگی کی ہزار ہا راہوں اور بے شمار نگاہوں کی لفظی مرقع نگاری میں جو حقیقت پسندی، رجائیت اور بے باکی ہمیں رجحان ساز ادیبہ کی تحریروں میں دکھائی دیتی ہے وہ ان کے منفرد اسلوب کی دلیل ہے۔ معاشرتی زندگی میں خواتین کی حالتِ زار، سماجی زندگی کے تضادات، مناقشات اور بے اعتدالیاں بانو قدسیہ کے اسلوب میں اساسی اہمیت کی حامل ہیں۔ متنوع ڈسکورس، اظہار و ابلاغ کے کمال اور زبان و بیان پر خلاقانہ دسترس کے اعجاز سے ان کا منفرد اسلوب قلب اور روح کی اتھاہ گہرائیوں میں اُتر جانے والی جس اثر آفرینی سے متمتع ہوا وہ اپنی مثال آپ ہے۔ بانو قدسیہ کی عدیم النظیر ادبی کامرانیوں کو دیکھ کر ذہن میں اختر الایمان کے یہ شعر گونجنے لگتے ہیں۔

ایک حسینہ درماندہ سی بے بس تنہا دیکھ رہی ہے
جیون کی پگڈنڈی یوں ہی تاریکی میں بل کھاتی ہے
کون ستارے چُھو سکتا ہے راہ میں سانس اکھڑ جاتی ہے

راہ کے پیچ و خم میں کوئی راہی اُلجھا دیکھ رہی ہے

بانو قدسیہ کی علمی ،ادبی اور قومی خدمات تاریخ ادب کا ایک درخشاں باب ہیں ۔ان کی ادبی خدمات کے اعتراف میں ان کو درج ذیل اعزازات سے نوازا گیا:

ستارۂ امتیاز(2003)،ہلالِ امتیاز(2010)،کمالِ فن ایوارڈ(2010)

بانو قدسیہ کو تاج ایوارڈ برائے بہترین ڈرامہ نگار سے بھی نوازا گیا۔

نگار ایوارڈ برائے بہترین ڈرامہ نگار1986 ۔اس کے بعد مسلسل تین برس تک (1988-1990) بانو قدسیہ کو بہترین ڈرامہ نگار کے نگار ایوارڈ سے نوازا گیا۔یہ وہ منفرد اعزاز و امتیاز ہے جس میں کوئی ان کا شریک و سہیم نہیں ۔ بانو قدسیہ اور اشفاق احمد نے اپنی دنیا آپ پیدا کی اور کٹھن حالات کا خندہ پیشانی سے سامنا کیا اور آلام روزگار کے مہیب بگولوں میں بھی عزم و استقلال کی شمع فروزاں رکھی۔وہ صحیح معنوں میں صبر و تحمل اور قناعت و استغنا کے پیکر سیلف میڈ تخلیق کار تھے۔بانو قدسیہ نے سیلف میڈ انسان کی پہچان کے متعلق حقائق کی گرہ کشائی کرتے ہوئے لکھا ہے:

"سیلف میڈ انسان کی آتش بازی احساس کم تری کی تیلی سے سُلگتی ہے اور مسالہ ختم ہونے کے بعد بھی شعلے جھاڑتی رہتی ہے ۔مسٹر سیلف میڈ زندگی کی اتنی ٹھوکریں ،کشمکش، مشکلات، زیادتی، دھاندلی، نکتہ چینی سہہ چکتا ہے کہ اِس ٹین کے کنستر میں چِب پڑ جاتے ہیں جیسے وہ اُونچے پہاڑ کے پتھروں سے ٹکراتا آیا ہو۔" (مردِ ابریشم، صفحہ 35)

بانو قدسیہ علم و ادب سے قلبی وابستگی رکھتی تھیں اور ان کا مطالعہ بہت وسیع تھا۔دنیا کے مختلف ممالک سے شائع ہونے والے ممتاز علمی و ادبی مجلات کا وہ نہایت باقاعدگی سے مطالعہ کرتی تھیں اور مدیران جرائد کو خط لکھ کر انھیں ان مجلات کے مشمولات پر اپنے تاثرات سے آگاہ کرتی تھیں ۔ اپنی شدید علالت کے دوران بھی وہ مطالعۂ ادب میں مصروف رہتی تھیں اور معاصر ادب کے بارے میں اپنے تاثرات سے اپنے بیٹے کو آگاہ کرتی تھیں اور یہ تاکید کرتی تھیں کہ وہ مدیران جرائد کو یہ مکتوبات ارسال کر دیں ۔ان کی اس علم دوستی اور ادب پروری کے اعجاز سے تخلیق کاروں اور قارئینِ ادب میں تخلیق ادب، عصری مسائل اور حالات کے ارتعاشات کے بارے میں مثبت شعور و آگہی پیدا کرنے میں مدد ملتی تھی۔ دولتالہ (راول پنڈی) سے شائع ہونے والے ادبی مجلے "صبح بہاراں" کی ستمبر 2016 کی اشاعت میں میرا افسانہ "کرموں موچی" شامل تھا۔ اکتوبر 2016 کے "صبح بہاراں" میں بانو قدسیہ کے فرزند اثیر احمد خان نے اپنے ایک مکتوب میں اس افسانے کے بارے میں اپنے تاثرات بیان کرتے ہوئے لکھا:

"ضعیفی کی وجہ سے امی (بانو آپا) پڑھنے لکھنے میں یکسوئی نہیں رکھ سکتیں اور انھوں نے یہ ذمہ داری میرے اوپر ڈال دی ہے اب اس کو میں نے ہی دیکھنا ہے۔ "کرموں موچی" قسط وار افسانہ جو غلام ابن سلطان (ڈاکٹر غلام شبیر رانا) کا ہے جو جھنگ سے تعلق رکھتے ہیں۔انھوں نے قدرت اللہ شہاب کی کرموں موچی کے ساتھ ایک دلچسپ دبنگ لہجے میں معنی خیز گفتگو کو لفظوں میں خوب سنوارا ہے۔یہ افسانہ خراجِ تحسین کے لائق ہے۔۔۔"

مطالعۂ ادب کے حوالے بانو قدسیہ کے ایسے جذبات قابل قدر ہیں۔وہ تاریخ اور اس کے مسلسل عمل پر پختہ یقین رکھتی تھیں۔سائنس اور ٹیکنالوجی کے عروج کے موجودہ زمانے میں زندگی کی برق رفتاریوں نے فکر و نظر کی کایا پلٹ دی ہے اور قارئینِ ادب کے فہم و ادراک اور اعصاب پر بھی اس کے دُور رس اثرات مرتب ہو رہے ہیں ۔یہ امر اطمینان بخش ہے کہ افسانے "کرموں موچی" کے بارے میں بانو قدسیہ کے ایما پر ذوق سلیم کے آئینہ دار یہ تاثرات سامنے آئے۔

علم بشریات اور سوشیالوجی کے ماہرین کا خیال ہے کہ پس ماندہ ممالک کے معاشرے میں مَردوں کو ہر دور میں بالادستی حاصل رہی ہے۔اکثر پس ماندہ ممالک کے دُور افتادہ دیہی علاقوں میں شرح خواندگی کی کمی اور ناقص معیار زندگی کے باعث خواتین اپنے بنیادی حقوق سے محروم ہیں ۔سرمایہ دارانہ اور جاگیردارانہ نظام کے چنگل میں جکڑے ہوئے بے بس و لاچار، غریب اور مظلوم انسانوں کی زندگی اجیرن کر دی گئی ہے ۔ بانو قدسیہ نے خواتین کے ساتھ روا رکھے جانے والے اہانت آمیز امتیازی سلوک ،شقاوت آمیز ناانصافیوں اور جور و ستم کے خلاف کھُل کر لکھا۔ دُکھی انسانیت کی توہین ،تذلیل ،تضحیک اور بے توقیری کے خلاف وہ پورے قد سے کھڑی دکھائی دیتی ہیں ۔فسطائی جبر کا ہر انداز مسترد کرتے ہوئے انھوں نے معاشرتی زندگی کے تضادات کے خلاف حریت فکر و عمل کا علم بلند رکھا۔اردو ادب میں تانیثیت کے حوالے سے بانو قدسیہ، ممتاز شیریں ، فاطمہ وصیہ جائسی ، ثمینہ راجا، نسرین انجم بھٹی، ساوتری گوسوامی، رضیہ بٹ ، حجاب امتیاز علی، انیتا غلام علی ،فاطمہ ثریا بجیا، خدیجہ مستور، ہاجرہ مسرور، پروین شاکر اور قرۃ العین حیدر کا نام ہمیشہ یاد رکھا جائے گا۔ اپنی تخلیقی تحریروں میں بانو قدسیہ نے خواتین سے ناخوش و بیزار رہنے والے جنسی جنون میں مبتلا سادیت پسند مردوں کو آئینہ دکھانے کی مقدور بھر کوشش کی ہے۔ بانو قدسیہ بے عیب اور لائقِ صد رشک و تحسین اسلوب کی مالک زیرک ، معاملہ فہم اور مدبر ادیبہ تھیں ۔وہ ادب کی کوہ پیکر شخصیت تھیں مگر ان کے مزاج میں عجز و انکسار، خلوص و دردمندی اور بے لوث محبت دیکھ کر سب ملاقاتی ان کی مسحور کن شخصیت کے معتقد و مداح بن جاتے تھے۔ہر ملاقاتی کے ساتھ اخلاق اور اخلاص سے لبریز سلوک کرنا زندگی بھر ان کا شیوہ رہا۔بانو قدسیہ نے ایک بھرپور اور کامیاب زندگی بسر کی۔ان کی زندگی میں کئی نشیب و فراز آئے مگر سال 2004 میں جب ان کے شوہر اشفاق احمد نے عدم کے کوچ کے لیے رخت سفر باندھ لیا تو اس ہونی نے بانو قدسیہ کی روح کو زخم زخم اور دِل کو کِرچی کِرچی کر دیا۔اشفاق احمد کی رحلت کے بعد بانو قدسیہ نے اپنی تمام توجہ اشفاق احمد کی غیر مطبوعہ منتشر تحریروں کو جمع کرنے اور مسودات کی اشاعت پر مرکوز کر دی۔ جب بانو قدسیہ

شدید علیل تھیں ،اس زمانے میں بھی ان کے فرزند اپنی والدہ کو ویل چیر پر ماڈل ٹاؤن کے شہرِ خموشاں میں اشفاق احمد کی آخری آرام گاہ پر لے جاتے اور بانو قدسیہ اپنے مرحوم شوہر کے لیے دعائے مغفرت کرنے کے بعد دیر تک ایام گزشتہ کی کتاب کی ورق گردانی میں مصروف رہتیں۔

محبت کی نفسیات جیسے اہم موضوع پر بانو قدسیہ کے خیالات فکر و خیال کے متعدد نئے دریچے وا کرتے ہیں ۔ قحط الرجال کے موجودہ زمانے میں صبر و تحمل کو شعار بنا کر انسانیت کے وقار، سربلندی، توقیر اور تکریم کے خواہاں کم کم نظر آتے ہیں۔ صبر و تحمل سے کٹھن اور صبر آزما حالات کا سامنا کرنا اور وقت کے ستم سہہ کر بھی یاس و ہراس کا شکار ہونے کے بجائے زندگی کی قدر کرنا بڑے دِل گُردے کا کام ہے۔ محبت کی نفسیات پر نظر رکھنے والے اس حقیقت سے آگاہ ہیں کہ جب قریۂ جاں میں محبت کی چنگاری بھڑکتی ہے تو دِل میں تمناؤں ، خواہشات اور اُمنگوں کا سیلِ رواں اُمڈ آتا ہے۔ تُند خُو مزاجوں کی دشت نوردی اور فرسودہ رواجوں کے صحراؤں کی خاک چھانتے ہوئے ہجومِ غم میں دِل کو سنبھالنا رہ نوردانِ شوق کی بہت بڑی آزمائش ہے۔ دِل کی نازک رگوں پر جان لیوا یادوں کی یلغار اور اہلِ جور کے وار سہتے ہوئے سینہ و دِل حسرتوں سے چھا جائے تو سے کے سم کا ثمر حوصلے پست کر دیتا ہے۔ بانو قدسیہ کا خیال تھا کہ محبت کے دشت پُر خار کے آبلہ پا مسافر اگر کڑی دھوپ کے اس سفر میں کسی سے کچھ طلب کرنا چاہیں تو خلوص ، دردمندی، وفا اور بے لوث محبت کے سوا کچھ نہ مانگا جائے۔ یہی وہ متاعِ بے بہا ہے جس کے بعد کسی اور چیز کی احتیاج باقی نہیں رہتی۔ ان کے علاوہ زندگی کی باقی ضروریات کی تکمیل تو بالکل اُسی طرح ہو جاتی ہے جس طرح شمعِ فروزاں پر منڈلانے والے اجل گرفتہ پروانوں کی راکھ کو ٹھکانے لگانے کے کئی بہانے سامنے آ جاتے ہیں۔ بانو قدسیہ کا خیال تھا کہ بے لوث، حقیقی اور سدا بہار محبت کا تقاضا یہ ہے کہ یہ بن مانگے مِل جائے ۔ محبت کے لیے کاسۂ گدائی لے کر کوچۂ محبوب کا طواف قلبی اور روحانی محبت کا بھرم دم توڑ دیتا ہے ۔ بھیک میں ملنے والی محبت دردِ دِل، خلوص اور مروت کی حلاوت سے تہی ہوتی ہے اور اس قسم کی محبت کو ہمیشہ ناکامی کا منھ دیکھنا پڑتا ہے۔ محبت میں ایسی ناکامی شخصیت کی شکست و ریخت اور کردار کے مکمل انہدام پر منتج ہوتی ہے۔ بانو قدسیہ کو نسائی جذبات کی لفظی مرقع نگاری پر کامل دسترس حاصل تھی ۔ مرد اور عورت کی محبت کے نازک رشتے کی ناکامی سے حالات جو رخ اختیار کرتے ہیں اس کے نتیجے میں عورت کی زندگی کی تمام رُتیں بے ثمر ہو جاتی ہیں۔ اس موضوع پر بانو قدسیہ نے لکھا ہے:

"عموماً محبت میں ناکامی کے بعد لوگ اپنی ہی نفی اور اپنی ذات کی تذلیل میں مصروف ہو جاتے ہیں۔ جب بند سیپی سے برآمد ہونے والے آب دار موتی کو اصل خریدار نہیں ملتا تو پھر موتی اپنے آپ کو ریت کے حوالے کر دیتا ہے۔ یہاں لہروں کے ساتھ رُلنے کے علاوہ اُس کی اور کوئی وقعت نہیں رہتی۔ وہ ہر کس و ناکس کے ہو کر کسی کے نہیں رہتے۔ رفتہ رفتہ اپنے جسم کی تذلیل میں انھیں لذت محسوس ہونے لگتی ہے۔ زندگی کا ہر وہ رنگ جو انھیں اپنے آپ پر ہنسنے کا موقع دے انھیں دِل سے مرغوب ہوتا ہے ۔ شراب ، عورت، جوا کئی ذلتوں کی پریس سے مرد نکلتا ہے۔ محبت میں ناکام ہو کر عورت کے دِل سے جسم کی حرمت ، عصمت اور عزت کا تصور جاتا رہتا ہے۔" (راجہ گدھ سے اقتباس)

"جس طرح گلزارِ ہستی میں پیہم عنبر فشانی میں مصروف گلِ تر اپنی عطر بیزی کے منابع سے ، ثمرِ نورس اپنی حلاوت کے ذخیرے سے، بُور لدے چھتنار اپنی گھنی چھاؤں کی اداؤں سے، دریا اپنی طغیانی سے ، حسنِ بے پروا اپنی حشر سامانی سے ، اُٹھتی جوانی اپنی طبع کی جولانی سے، سمندر اپنی گہرائی سے ، کلامِ نرم و نازک اپنی ہمہ گیر گرفت و گیرائی سے ، شعلہ اپنی تمازت سے ، گفتار اور رفتار اپنے معیار اور نزاکت سے ، کردار اپنے وقار سے ، جذبات و احساسات مستقبل کے خدشات اور اپنی بے کراں قوت و ہیبت سے ، نوخیز کونپلیں اپنی روئیدگی سے ، سے کا سم کے اپنے ثمر سے ، قوتِ عشق اپنی نمو سے ، سادگی اپنے دریئے پندار حیلہ جُو سے ، گنبد نیلوفری کے نیچے طیور کی اُڑان گھات میں بیٹھے صیاد کی مچان سے ، خلوص و دردمندی اپنی خُو سے ، حریتِ ضمیر اپنے خمیر سے ، موثر تدبیر سوچنے والے نوشتۂ تقدیر سے ، ایثار و عجز و انکسار کی راہ اپنانے والے جذبۂ بے اختیار کی پکار سے ، حسن و رومان کی داستان جی کے زیاں سے ، جبر کی ہیبت صبر کی قوت سے ، ظالم کی واہ مظلوم کی آہ سے ، جام کے دام چلانے والے مظلوموں کے ضمیر کی للکار سے اور تاریخ سے سبق نہ سیکھنے والے فراعنہ جاہ و حشمت کے طومار سے وابستہ حقائق کے بارے میں کچھ نہیں جانتے اسی طرح ایک تخلیق کار کے قلزمِ خیال کا پانی اس قدر گہرا ہوتا ہے کہ وہ زندگی بھر اس کی غواصی کرنے کے باوجود تخلیقی عمل کے پس پردہ کارفرما محرکات کے تاب دار موتی برآمد کرنے سے قاصر ہے۔"

خواتین کی زندگی کے نشیب و فراز کی لفظی مرقع نگاری کرتے وقت علامت نگاری میں بانو قدسیہ کو مہارت حاصل تھی۔ اپنے ایک افسانے میں اُنھوں نے اپنے ایک مرد کردار کی نفسیات کی گرہ کشائی کرتے ہوئے لکھا ہے:

"بہار اور خزاں کے دِن تتلیوں اور بھُولوں کی وجہ سے تکلیف دِہ تھے ۔ یہ دونوں چیزیں مجھ بہت پسند تھیں اور ان دونوں سے میں بہت خوف زدہ تھا۔ ایک دفعہ میں نے ایک زرد رنگ کی ایک تتلی پکڑ کر ایک گلاس کے نیچے بند کر دی ۔ اس کا دل بہلانے کے لیے میں نے دو چار رنگین پھول بھی ساتھ مقید کر دیئے ۔ یوں

زرد تتلی کو محبوس کرکے مجھے عجیب راحت سی محسوس ہوئی۔ لیکن جب میں دوپہر کا کھانا کھا کر لوٹا تو وہ تتلی پھولوں کی قبر میں پہلو کے بل پڑی تھی۔ میں نے اُسے پانی پلا کر زندہ کرنا چاہا تو اس کے پروں کا زرد برادہ میری انگلیوں پر اتر آیا۔ اس کے خوش رنگ پر زندہ رہے لیکن وہ خود مر گئی۔ تنہائی کی موت!" (امر بیل، صفحہ 78)

اشفاق احمد کی رحلت کے بعد بانو قدسیہ نے عملاً گوشہ نشینی اختیار کر لی تھی۔ گلشنِ ہستی میں عدم کا خوف کاروانِ وجود کو اس قدر یاس و ہراس میں مبتلا کر دیتا ہے کہ زندگی کی تمام رعنائیاں گہنا جاتی ہیں۔ دائمی مفارقت دینے والوں کے غم میں دِل سے خواہشیں ، تمنائیں ،آرزوئیں اور اُمنگیں ایک ایک کرکے رخصت ہونے لگتی ہیں۔ تقدیر کا دیا ہوا یہ غم انسان کو اندر سے کھوکھلا کر دیتا ہے کہ وہ پیارے لوگ جنھیں ہم دیکھ کر جیتے تھے اب وہ ہمیشہ کے لیے آنکھوں سے اوجھل ہو گئے ہیں۔ یادِ رفتگاں کا صدمہ جب الم نصیب پس ماندگان کے نہاں خانۂ دِل میں بس جائے تو یہ غم جان لے کر ہی نکلتا ہے۔ اشفاق احمد کی وفات کے بعد بانو قدسیہ کی کشتیٔ جاں سیلِ زماں کی لہروں کے گرداب میں اس طرح آئی کہ اسے سنبھالنے کی کوئی اُمید بر نہ آئی۔ عزتِ نفس اور خود اعتمادی کے ساتھ اپنے رفیقِ حیات کے ساتھ زندگی کا سفر طے کرنے والی اس عظیم ادیبہ کو اپنے شوہر کی وفات کے صدمے نے اندر سے منہدم کر دیا۔ قحط الرجال کے موجودہ زمانے کے غیر یقینی حالات کو دیکھتے ہوئے بھی ایک بات جو اٹل اور یقینی ہے وہ اجل کی تحریر ہے جسے کسی صورت میں تاخیر و تعطل یا التوا میں نہیں ڈالا جا سکتا۔ بانو قدسیہ نے ایک زیرک، فعال، مستعد اور جری ادیبہ کی حیثیت سے بھرپور زندگی بسر کی۔ بانو قدسیہ نے اپنے غم کا بھید کبھی نہ کھولا مگر سب لوگ جانتے تھے کہ اس نے اشفاق احمد کی دائمی مفارقت کے بعد ذہنی طور پر اشفاق احمد کے پاس جانے کی مکمل تیاری کر لی تھی۔ جب دِل کی ویرانی نے حشر سامانی کی صورت اختیار کر لی تو بانو قدسیہ نے چُپکے سے زینۂ ہستی سے اُتر کر عدم کی بے کراں وادیوں کی جانب رختِ سفر باندھ لیا اور ماڈل ٹاؤن ،لاہور کے شہرِ خموشاں میں اشفاق احمد کے پہلو میں ردائے خاک اوڑھ کر ابدی نیند سو گئیں۔

سب کہاں کچھ لالہ و گل میں نمایاں ہو گئیں
خاک میں کیا صورتیں ہوں گی کہ پنہاں ہو گئیں

(Dr.Ghulam Shabbir Rana (Mustafa Abad Jhang City

انیسویں صدی کے اواخر اور بیسویں صدی کے اوائل میں جب اردو میں مغربی اصولوں کے تحت تاریخ نویسی اور تنقید نگاری کا آغاز ہو رہا تھا۔ اور ہم احساس شکست کے ساتھ احساس کمتری کا بھی شکار تھے اور ہماری اثر پذیری کا دائرہ محدود تھا اس لیے ہم نے ایران اور مغرب کے نام نہاد تہذیبی برتری کے رویوں کو خود پر منطبق کرنے کی کوشش کی اور اس طرح کے رویوں کا انجام یہ ہوا کہ خود ہندوستانیوں کی نظر میں بیدل ،غالب اور اقبال جیسے بڑے شاعروں کے فارسی کلام پایہء ثبوت سے ساقط قرار پائے۔ شبلی نعمانی کی شعر العجم اس کی واضح مثال ہے جہاں تک نظیر اکبر آبادی جیسے پر گو اور قومی حسیت کے حامل شاعر کا تعلق ہے تو اسے نا قابل استناد تو کجا زیادہ تر نا قابل اعتنا ہی سمجھا گیا۔ لیکن پہلے فیلن وغیرہ کا اعتراف اور پھر ترقی پسندوں کی ارضیت پسندی نظیر کو معتبر اور معتمد بنانے میں کافی معاون ہوئی۔ بہر کیف جب ہم بات کرتے ہیں کلام نظیر کے انگریزی تراجم کا تو یہاں بھی ان پر مترجمین کی ویسی توجہ نظر نہیں آتی ہے جس طرح وہ نظیر سے کہتر اور دوسرے درجہ کے شعراء کے کلام کو سمجھنے اور سمجھانے میں غلطاں و پیچاں ہیں۔ لیکن عالمی تقاضے اور خود کی بازیافت کی خواہش نظیر اکبر آبادی پر بھی از سر نو غور کرنے کا سبب ہوئی اور وقت کے ساتھ اس میں سرعت آتی گئی۔ خاص کر پچھلے پچیس تیس برسوں میں برقیاتی انقلاب و مہاجرت نے مختلف تہذیبوں کے اختلاط کے عمل تیز تر کیا اور مختلف تہذیبوں کی بیچ کی دوریوں میں کمی اور تہذیبی تصادم کے نظریہ کو ضرب پہنچی۔ عالمی گاؤں یا گلوبل ولیج (Global Village) کا تصور ایک حقیقت بنا۔ ایک دوسرے کو اور بہتر طریقے سے جاننے اور سمجھنے کا عمل تیز تر ہوا اور اس میں اپنی پہچان و شناخت قائم کرنے کی خواہش و ضرورت بھی۔ دنیائے ادب میں جس عالمی ادب کا تصور بہت زمانے تک مبہم تھا اب اس کے امکانات کے نقوش زیادہ روشن ہوئے۔ ادب اور اس کا ترجمہ دنیا کے عرفان و آگہی کا ذریعہ اور عالمی ادب کے تصور کو ایک ٹھوس حقیقت میں تبدیل کرنے کا ایک ناگزیر وسیلہ بنا۔ پروفیسر محمد حسن عالمی منظر نامے میں ترجمہ کی افادیت کا تجزیہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ:

"اس میں کوئی شک نہیں کہ آج جب دنیا کی طنابیں کھنچ رہی ہیں اور عالم گیر سطح پر ایک اکائی بنتا جا رہا ہے کوئی بھی زبان ترجمہ کے بغیر زندہ نہیں رہ سکتی۔ جب تک نئے خیالات کا خون اور نئی آگہی کا نور رگ و پے میں سرایت نہ کرے زندگی دشوار ہے۔"

******